حضرت مولانا محمد طاسین صاحب
مجلس علمی کراچی

اُدھار چیز زیادہ قیمت پر بیچنے کی شرعی حیثیت

محترم قاضی صاحب کے جوابی مضمون سے متعلق چند گزارشات

اس موضوع پر حضرت مولانا محمد طاسین صاحب مدظلہ کے مقالہ شائع شدہ الحق کے جواب میں حضرت مولانا قاضی عبد الکریم صاحب کلاچوی مدظلہ اور حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب حقانی مدظلہ کی تحریریں الحق کے گذشتہ شماروں میں شائع ہوچکی ہیں حضرت مولانا محمد طاسین صاحب نے حضرت قاضی صاحب کے جواب میں جو تحریر ارسال فرمائی ہے ذیل میں اسے شائع کیا جا رہا ہے اس سلسلہ میں ان کے دو خطوط بھی موصول ہوئے ہیں دونوں خطوط موضوع سے متعلق ہیں اس لیے وہ بھی نذر قارئین ہیں۔

(ادارہ)

مکتوب اوّل! بعید ممنون ہوں کہ آپ نے ایک اختلافی مسئلہ سے متعلق میرا مضمون موقر ماہنامہ الحق میں شائع فرمایا، دوسری قسط کے شروع میں ادارتی شذرہ سے معلوم ہوا کہ اس کے جواب میں بعض حضرات کے مضامین آرہے ہیں اچھا ہے آئیں اور شائع ہوں اور حقیقت حال کھل اور نکھر کر سامنے آجائے، دین کا معاملہ ہے دینی دلائل کی روشنی میں اس پر بحث و تمحیص کا سب کو حق ہے، اگر دلائل سے میرا لکھا ہوا غلط ثابت ہوجائے تو فوراً رجوع کرلوں گا اور الحق ہی میں اپنی غلطی کا اعلان کردونگا، میرے لیے یہ کوئی ذاتی وقار کا مسئلہ نہیں ہوگا مجھے صرف حق کی اتباع مقصود ہے، بہرحال شخصیات سے نہیں بلکہ صرف اور صرف دلائل سے ہی میں متاثر ہوسکتا ہوں۔

(۳، مارچ ۱۹۹۲ء)

مکتوب ثانی! حضرت مفتی صاحب کے جوابی مضمون کی دوسری قسط بھی پڑھنے کا موقع ملا موصوف نیک اور مخلص عالم دین ہیں درس و تدریس اور روایتی فتویٰ نویسی سے ان کا شغف رہا ہے ان کا مضمون اسی کا عکاس ہے۔ اختلافی مسائل میں بحث و تمحیص کا ایک خاص اسلوب ہے جو اپنی رائے کی تائید اور دوسرے کی رائے کی تردید میں عام طور پر درس حدیث تک میں اختیار کیا جاتا ہے احتمالات کے ذریعے مسلمہ ائمہ مجتہدین کے اقوال کو کنڈم اور رد کردیا جاتا ہے میں خود بھی ایک عرصہ تک یہی انداز بحث اپنائے رہا جب جامعہ اسلامیہ امروہہ میں جامع الترمذی اور بیضاوی وغیرہ کتابیں پڑھاتا تھا یہ انداز اس وقت بدلا جب حضرت شاہ ولی اللہ، ابن تیمیہ، ابن القیم، امام الشعرانی وغیرہ منصف مزاج

محقق علماء کرام کی کتابوں کو پڑھنے کا موقع ملا۔

مختصر یہ کہ میں محترم مفتی صاحب کے جواب میں مناظرانہ انداز سے کچھ لکھنے کو تضیع اوقات سمجھتا ہوں قارئین الحق میں جو اعلیٰ اور ممتاز بصیرت اور فہم و فراست کے مالک ہیں وہ خود فیصلہ کرلیں گے کہ مسئلہ زیر بحث میں صحیح موقف کس کا ہے، علاوہ ازیں محترم قاضی عبدالکریم کے مضمون سے متعلق میرا جو مضمون موقر ماہنامہ الحق میں شائع ہونے والا ہے اس کو غور سے پڑھا جائے تو اس میں مفتی صاحب کی بہت سی ایسی باتوں کا جواب موجود ہے جو اصل مسئلہ سے متعلق ہیں غیر متعلق باتوں سے ہمیں کچھ بحث نہیں، بہر حال یہ ضرور عرض کروں گا کہ مفتی صاحب نے ادھار چیز زیادہ قیمت پر بیچنے خریدنے کے جواز سے متعلق جو بزعم خود منطقی دلائل تحریر فرمائے ہیں سود کو جائز کہنے والے ان سے خوب فائدہ اٹھا سکتے ہیں وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ جو فریق دوسرے کو سود پر قرض دیتا ہے کہ وہ دوسرے کو فائدہ پہنچاتا ہے اور اس کے لیے کاروبار وغیرہ کا موقع مہیا کرتا ہے لہذا اس کے عوض قرض کی اصل رقم پر کچھ زائد لینا ازروئے عقل و منطق اس کے لیے جائز ہوتا ہے گویا مفتی صاحب کے دلائل میں تجارتی نوعیت کے قرضوں پر جواز سود کا فتویٰ مستور و مضمر ہے۔

عہد حاضر میں مروجہ معاشی مسائل پر لکھنا اور ان کے متعلق اسلامی نقطہ نظر سامنے لانا، ان اہل علم حضرات کے بس کا ہیں جنھوں نے علم المعاشیات اور جدید معاشی نظاموں کا بغور مطالعہ کیا ہے بدقسمتی سے وہ مسئلہ کی حقیقت اور اس کے دور رس معروضی نتائج کا صحیح علم و فہم ہی نہیں رکھتے اس کا صحیح جواب تو درکنار۔

بہر حال میں آئندہ کسی سے اس مسئلہ کے متعلق بحث و تمحیص میں الجھنا نہیں چاہتا جو حضرات اس کے جواز کے فتوے دے چکے ہیں وہ ظاہر ہے کہ اپنے فتوے کی تائید و تصویب میں ایڑی چوٹی کا زور لگائیں گے اور بے جان منطقی دلائل سے کام فرمائیں گے لہذا ان سے بحث و مباحثے کا کچھ فائدہ نہیں نکل سکتا تو پھر اس بحث میں کیوں وقت ضائع کیا جائے۔

میرا یہ جو موقف ہے کہ میں اسلام کے حوالے سے صرف اس قول و رائے کو اسلامی مانتا ہوں جس کا اجمالی یا تفصیلی ثبوت کتاب و سنت میں موجود ہو ورنہ نہیں، اس کی تائید میں میں علماء محققین کی کتابوں سے بکثرت عبارات پیش کرسکتا ہوں عالم کے لیے کسی کی اندھی تقلید جائز نہیں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "عقد الجید" کا مطالعہ اس کے لیے بہت مفید ثابت ہوسکتا ہے، اسی طرح النافع الکبیر لمن یطالع جامع الکبیر علامہ عبدالحی لکھنوی کی ہر ایک حنفی مفتی کو ضرور پڑھنی چاہیئے۔

نہ چاہتے ہوئے بھی باوجود بات طویل ہوگئی اللہ کرے باعث ملال نہ ہو! دعوات صالحہ کا ہر حال میں محتاج ہوں امید فراموش نہ فرمائیں گے۔

(۱۷ جون ۱۹۹۲ء)

والسلام

احقر محمد طاسین عفی عنہ

بڑی خوشی کی بات ہے کہ محترم المقام حضرت قاضی عبد الکریم صاحب کلاچوی مدظلہم نے میرے مضمون کا جواب تحریر فرمایا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مسئلہ سے دلچسپی رکھنے والے دیگر اہل علم حضرات بھی اس پر لکھیں، تاکہ اصل حقیقت حال نکھر کر سامنے آئے۔ البتہ اس کے لیے ضروری ہے کہ خوب اچھی طرح تیاری کر کے سنجیدہ انداز سے اور مضبوط دلائل کے ساتھ تحقیق حق کے مقصد سے لکھا جائے، کیونکہ یہ مسئلہ حقوق العباد سے متعلق اور حلال و حرام کا مسئلہ ہے، لہٰذا اس میں پوری احتیاط ہونی چاہیے۔

حضرت قاضی صاحب موصوف کے جوابی مضمون کو بغور پڑھنے کے بعد ایک تو محسوس ہوا کہ انہوں نے اس مسئلہ کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش نہیں فرمائی جس کو میں نے اپنے مضمون میں قدرے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے، کیونکہ انہوں نے اپنے جواب میں امام محمد الشیبانی کی "کتاب الاصل" اور علامہ السرخسی کی "المبسوط" سے جو عبارات پیش فرمائی ہیں وہ ایک دوسرے معاملہ سے متعلق ہیں، میرے زیر بحث معاملہ سے متعلق نہیں۔ ان عبارات میں جس معاملے کا ذکر ہے اس کی صورت یہ ہے کہ ایک بائع مشتری سے کہتا ہے کہ اگر ابھی نقد ادا کرو تو میری اس چیز کے ثمن اتنے اور اگر سال کے ادھار پر لو تو اس کے ثمن اتنے ہوں گے، اس معاملہ کے فاسد و ناجائز ہونے کی وجہ مذکورہ عبارات میں یہ بتلائی گئی ہے کہ اس میں ثمن کی جہالت کے ساتھ دو شرطیں موجود ہیں، جن کی ایک حدیث نبوی میں واضح ممانعت ہے۔ لیکن اس کے بعد "المبسوط" میں یہ بھی لکھا ہے کہ فریقین جدا ہونے سے پہلے اسی مجلس میں ایک شکل پر متفق ہو جائیں تو معاملہ جائز ہو جاتا ہے ـــــ جبکہ میرے زیر بحث معاملہ کی صورت یہ ہے کہ بائع یہ جانتے ہوئے کہ مشتری میری چیز کو نقد سے نہیں خرید سکتا بلکہ صرف ادھار ہی سے خرید سکتا اور خریدنا چاہتا ہے لہٰذا وہ معاملہ کرتے وقت نقد کا نام ہی نہیں لیتا اور صرف ادھار کی بات کرتا اور کہتا ہے کہ میری یہ چیز جس کی بازار میں مثلاً ایک ہزار روپے قیمت مقرر ہے اور نقد کی صورت میں ایک ہزار روپے میں عام طور پر لی دی جاتی ہے ایک سال کے ادھار پر ڈیڑھ ہزار روپے میں دے سکتا ہوں، ظاہر ہے کہ معاملہ کی اس صورت میں نہ ثمن میں تردد اور جہالت ہے اور نہ اس کے اندر دو شرطیں پائی جاتی ہیں، لہٰذا یہ معاملہ اس معاملے سے مختلف ہے جس کا "کتاب الاصل" اور "المبسوط" کی عبارات میں ذکر ہے، لہٰذا اس کے جواز و عدم جواز کا اس معاملے کے جواز و عدم جواز سے کوئی تعلق نہیں گویا ان عبارات کو بلا ضرورت نقل کیا گیا ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں یہاں یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ بیچی / خریدی جانے والی چیزیں دراصل دو طرح کی ہوتی ہیں ایک وہ جن کی بازار میں قیمت مقرر ہوتی ہے اور مقررہ نرخ پر ان کی خرید و فروخت کی جاتی ہے اور دوسری وہ جن کی نہ بازار میں قیمت مقرر ہوتی اور نہ عام طور پر ان کی بیع و شراء ہوتی ہے۔ پہلی قسم کی چیزوں کو ان کا مالک نقد کی صورت میں ہر اس ثمن کے عوض بیچ سکتا ہے جس پر وہ اور خریدار رضامند ہو جائیں۔ اس طرح کا ثمن بازار کی مقررہ قیمت کے برابر بھی ہو سکتا ہے اور اس سے کچھ کم یا زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً بازار کے نرخ کے مطابق اس چیز کی

قیمت سو روپے ہے تو نقد خرید و فروخت میں وہ پورے سو روپے میں بھی لی دی جاسکتی ہے اور سو روپے سے کچھ کم اور زیادہ میں بھی لی دی جاسکتی ہے، اگرچہ زیادہ میں اس کا لین دین بہت ہی کم کہیں ہوتا ہے اور عام طور پر نقد سے خریدنے والا اس قیمت سے زائد نہیں دیتا جو بازار میں رائج ہوتی ہے۔ ادھار کی صورت میں ایسی چیزوں کو بازار کی مقررہ قیمت سے زائد ثمن میں لینا دینا اس وجہ سے ناجائز قرار پاتا ہے کہ اس میں اصل قیمت پر جو زائد ہوتا ہے وہ اجل اور مدتِ قرض کے عوض ہوتا ہے لہٰذا وہ ربوالنسیہ کے تحت آتا ہے جو حرام ہے۔

دوسری قسم کی چیزیں وہ ہوتی ہیں جن کی بازاری نرخ کے مطابق قیمت مقرر نہیں ہوتی اور نہ عام طور پر بازاروں میں ان کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ ایسی چیزیں نقد کی صورت میں بھی اور ادھار کی صورت میں بھی فریقین جس ثمن پر چاہیں خرید و فروخت کر سکتے ہیں، ایسی چیزوں کی چونکہ بازاری نرخ سے کوئی قیمت مقرر نہیں ہوتی لہٰذا ان کے کسی ثمن کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ ان کی اصل قیمت سے زیادہ ہے، کیونکہ زیادہ کا تصور اس وقت ہوتا ہے جب اصل قیمت متعین ہو جو یہاں متعین نہیں ہوتی۔ بنابریں ایسی چیزوں کے ادھار کے ثمن کو اصل قیمت، اور نقد کے ثمن کو اصل قیمت سے کم رعایتی قیمت قرار دیا جاسکتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ادھار کی صورت میں، نقد کی صورت کی نسبت ثمن میں جو زیادتی ہوتی ہے اس کو اجل یعنی مدت ادھار کا عوض نہیں کہا جاسکتا، لہٰذا یہ معاملہ ربوالنسیہ کے مشابہ اور حرام نہیں ہوتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگر مذکورہ دو قسم کی چیزوں کی مثال سے وضاحت کر دی جائے تو حقیقتِ حال اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے گی۔ پہلی قسم کی چیزوں کی مثال وہ مختلف قسم کی مشینیں، موٹر سائیکل، موٹر کار، ٹرک نیز وہ تمام اشیاء جن کے بازاروں میں نرخ مقرر ہوتے اور ناپ تول گنتی وغیرہ کے ذریعے ان کی خرید و فروخت کی جاتی ہے۔ نقد کی صورت میں ایسی چیزوں کی خرید و فروخت ہر اس ثمن پر جائز ہوتی ہے جس پر فریقین یعنی بائع اور مشتری کا اتفاق ہو جائے اور ان کی رضامندی موجود ہو، خواہ وہ اصل بازاری قیمت کے برابر ہو یا اس سے کم اور کچھ زیادہ ہو۔ لیکن ادھار کی صورت میں ایسی چیزوں کی خرید و فروخت اس ثمن پر تو جائز ہوتی ہے جو بازاری قیمت کے برابر ہو لیکن اس ثمن پر جائز نہیں ہوتی جو بازاری قیمت سے جائز ہو، مثلاً ایک مشین یا گاڑی جس کی قیمت کمپنی کی طرف سے مثلاً ایک لاکھ روپے مقرر ہوتی اور اس قیمت پر وہ بازار میں فروخت ہوتی ہے ایک مالدار شخص اس کو ایک لاکھ میں خرید کر دوسرے شخص پر ایک سال کے ادھار سے ڈیڑھ لاکھ میں فروخت کرتا ہے اور طے کرتا ہے کہ ادائیگی ایک سال کے اندر قسطوں میں ہوتی رہے گی یا سال پورا ہونے پر یکمشت ہوگی تو یہ معاملہ ربوٰ سے مشابہ ہونے کی وجہ سے ناجائز قرار پاتا ہے۔ میں نے اپنے مضمون میں ادھار کی جس شکل کو ناجائز بتلایا ہے وہ صرف یہی شکل ہے جس نے آج ایک باقاعدہ کاروبار کی صورت اختیار کر لی ہے اور غلط فہمی سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلام میں یہ جائز اور حلال ہے۔ میں نے

قرآن و حدیث کے جن دلائل کی بنا پر اس کو ناجائز لکھا ہے وہ میرے مضمون میں واضح طور پر موجود ہیں۔ جن اصحاب علم کے نزدیک میرے دلائل اور ان سے اخذ کردہ نتیجہ غلط ہے ان پر لازم آتا ہے کہ وہ معاملہ مذکورہ کو قرآن و حدیث اور اجماع و قیاس سے جائز ثابت کریں۔ اگر جائز ثابت کر دیں گے تو میں فوراً اپنی غلطی کا اعتراف اور اعلان کر دوں گا۔

دوسری قسم کی چیزوں کی مثال مکانوں سے دی جا سکتی ہے جن کی بازاروں میں نہ خاص نرخ سے ایک قیمت مقرر ہوتی ہے نہ اشیاء منقولہ کی طرح خرید و فروخت ہوتی ہے۔ مکانات چونکہ اپنے تعمیری نقشے، تعمیری مواد، چھوٹے بڑے، نئے و پرانے، اور محل وقوع وغیرہ کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، لہٰذا ان کی قیمتیں بھی مختلف ہوتی ہیں جیسا کہ سب جانتے ہیں اور چونکہ مذکورہ امور کی بنا پر ان کی کوئی ایک قیمت مقرر نہیں ہوتی لہٰذا نقد اور ادھار جس صورت میں بھی ان کی خرید و فروخت جس ثمن پر بھی ہو جائز ہوتی ہے۔ مکان بیچنے والا خریدنے والے سے کہتا ہے کہ اگر نقد ادا کرو تو ثمن مثلاً ایک لاکھ اور سال کے ادھار پر لو تو ثمن سوا لاکھ ہوں گے تو یہ معاملہ اس وجہ سے درست ہوتا ہے کہ ادھار کی صورت میں جو پچیس ہزار کا اضافہ ہے وہ اصل قیمت پر مدت ادھار کے عوض اضافہ نہیں۔ اس لیے کہ یہاں اصل قیمت سرے سے متعین ہی نہیں، بلکہ اس صورت میں کہہ سکتے ہیں کہ ادھار والے ثمن اصل قیمت کے قائم مقام اور نقد والے ثمن بطور رعایت کے کم ہیں، نہ یہ کہ نقد والے ثمن اصل قیمت اور ادھار والے ثمن اس پر اضافہ ہیں، کیونکہ ثمن اور قیمت کے درمیان لزوم اور تساوی کا تعلق نہیں بلکہ عام و خاص مطلق کا تعلق ہے۔ یعنی ہر قیمت تو ثمن ہو سکتی ہے لیکن ہر ثمن قیمت نہیں ہوتا کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بسا اوقات ایک چیز بازار کی قیمت سے کم ثمن پر بیچی خریدی جاتی ہے۔ ایسی بیع کا نام "بیع بالوضیعہ" ہے جو بالکل جائز مانی گئی ہے۔ اسی طرح ادھار کے ثمن کے لیے بھی لازمی نہیں کہ وہ چیز کی اصل قیمت سے ہمیشہ زائد ہو کیونکہ قرض حسن کی صورت میں ادھار چیز کے ثمن اصل قیمت کے برابر ہوتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں "المبسوط" میں جس معاملے کا ذکر اور اس کی ایک صورت کے جواز کا بیان ہے اس کا تعلق دوسری قسم کی کسی چیز سے ہے جس کی بازار میں قیمت مقرر نہیں ہوتی، لہٰذا اس کو نقد کی صورت میں کم ثمن پر اور ادھار کی صورت میں زیادہ ثمن پر بیچا خریدا جا سکتا ہے جو جائز ہوتا ہے۔

اور اگر کسی کو اس پر اصرار ہو کہ المبسوط کی مذکورہ عبارت سے ہر چیز کو ادھار کی صورت میں زیادہ ثمن پر بیچنے خریدنے کا جواز نکلتا ہے تو ظاہر ہے کہ ان کی اس عبارت کی حیثیت قرآن کی آیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی سی نہیں، بلکہ اس سے جو بات نکلتی یا نکالی جاتی ہے وہ اپنی صحت کے لیے شرعی دلیل کی محتاج ہے حالانکہ وہاں کوئی ایسی دلیل مذکور نہیں جو حلال و حرام کے ثبوت کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ اسی طرح "المبسوط" اور "الہدایہ" کی وہ عبارات جو باب المرابحہ کے ایک جزئیے میں مذکور ہیں اور جن کو بعض کتب فتاویٰ میں مسئلہ زیر بحث کے جواز

کے متعلق بطور دلیل پیش کیا گیا ہے، ان سے کہیں یہ ظاہر اور ثابت نہیں ہوتا کہ ادھار پہ بیچی خریدی جانے والی ہر چیز کے ثمن میں اجل کے عوض اضافہ کرنا شرعاً جائز ہے، ان سے زیادہ سے زیادہ جو ثابت ہوتا ہے وہ یہ کہ لوگ عادۃً ایسا کرتے ہیں اور یہ کوئی شرعی دلیل نہیں۔ شرعی دلیل وہ ہوتی ہے جس کا اجمالی یا تفصیلی ذکر قرآن و حدیث میں ہو۔ صاحب ہدایہ کی اس عبارت " الا یریٰ انه یزداد فی الثّمن لاجل الاجل " سے مطلب لینا کہ ان کے نزدیک اجل کے عوض ثمن میں اضافہ جائز ہے ان کی طرف ایک ایسے مطلب کو منسوب کرنا ہے جو کسی طرح ان کا مطلب نہیں اور " توجیه القول بما لا یرضی به قائله " کا مصداق ہے۔

بہر حال میں یہاں یہ عرض کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ میں نے مسئلہ زیر بحث پر جو لکھا ہے وہ اپنے اس علم و فہم کے مطابق لکھا ہے جو اللہ علیم و خبیر نے مجھے اپنی رحمت سے عطا فرمایا ہے۔ د۔ لکھنے سے پہلے بہت کچھ پڑھا اور سوچا ہے مجھے اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم کتب خانہ دے رکھا ہے اور میں نے اس سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ جہاں تک خطا، و غلطی کا تعلق ہے وہ بڑے سے بڑے مجتہد سے بھی ہو سکتی ہے۔ ایک حدیث نبوی کے مطابق مجتہد کی اجتہادی رائے صحیح و صواب بھی ہو سکتی ہے اور غلط و خطا بھی ہو سکتی ہے، اگرچہ خطا کی صورت میں بھی اس کو اجر ملتا ہے۔ رہے ہم جیسے اہل علم تو وہ کس شمار و قطار میں ہیں اور ان کا کیا مقام ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ میں نے کسی دارالافتاء کا سکہ بند مفتی اور نہ کسی عدالت کا رسمی قاضی ہوں، لہٰذا میری تحریر کی حیثیت نہ فتوے کی ہے اور نہ فیصلے کی، بلکہ ایک سوال کے متعلق علمی و تحقیقی جواب کی ہے جو قرآن و حدیث کے حوالے سے مجھ سے دریافت کیا گیا۔

میرے مضمون کی دوسری بات جس کا جواب دینے کی حضرت قاضی صاحب موصوف نے زحمت فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ میں نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ جو اہل علم حضرات معاملہ زیر بحث کے جواز کے قائل ہیں وہ اس کے ثبوت میں نہ قرآن مجید کی کوئی آیت پیش فرماتے ہیں نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث، نہ آثار صحابہ و تابعین میں سے کوئی اثر، نہ حضرات ائمہ مجتہدین کا کوئی اجتہادی قول اور نہ مسلمہ قواعد فقہیہ میں سے کوئی فقہی قاعدہ پیش فرماتے ہیں، بلکہ بطور دلیل فقہ حنفی کی دو کتابوں " المبسوط " اور " الہدایہ " کی ایک عبارت پیش فرماتے ہیں الخ۔ اس کے جواب میں قاضی صاحب موصوف نے جو تحریر فرمایا ہے اس میں بطور جواب نہ قرآن حکیم کی کوئی آیت پیش فرمائی ہے، نہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث اگرچہ ضعیف ہی ہو، نہ آثار صحابہ و تابعین میں سے کوئی قولی و فعلی اثر اور نہ فقہی قواعد کلیہ میں سے کوئی قاعدہ کلیہ پیش فرمانے کی زحمت فرمائی ہے بلکہ صرف " کتاب الاصل " سے امام محمد الشیبانی کا ایک قول نقل فرمایا ہے۔ حالانکہ ائمہ مجتہدین سے میری مراد وہ ائمہ اربعہ تھے جن کی طرف چار فقہی مذاہب منسوب ہیں نہ کہ ان کے شاگرد جن کا درجہ مجتہد فی المذہب کا تو ہے لیکن مجتہد مطلق کا نہیں۔ بہر حال میں امام محمدؒ کے قول کو بھی مجتہد کا قول مانتا ہوں لیکن تعجب اور تاسف کی بات یہ ہے کہ قاضی صاحب موصوف نے کتاب الاصل سے امام محمدؒ کا جو

قول نقل فرمایا ہے اس کا میرے زیر بحث مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے کسی لفظ سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ادھار چیز زیادہ قیمت پر بیچنا خریدنا ناجائز ہے، بلکہ اس قول کا جس معاملے سے تعلق اور جس کو خود امام محمدؒ نے ناجائز کہا ہے وہ دوسرا معاملہ ہے جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے اور جس کی ایک شکل کو صاحب مبسوط نے تو جائز کہا لیکن کتاب الاصل میں نہ اس شکل کا ذکر ہے اور نہ اس کے جواز کا، بلکہ صرف اس شکل کا ذکر ہے جس کو صاحب مبسوط نے بھی فاسد ناجائز لکھا ہے۔ امام محمدؒ نے کتاب الاصل میں کہیں یہ نہیں لکھا کہ اس معاملے کی ایک شکل جائز بھی ہے جیسا کہ علامہ السرخسی نے المبسوط میں لکھا ہے، لیکن محترم قاضی صاحب نے اپنے جوابی مضمون میں علامہ السرخسی کی جائز کردہ شکل کو امام محمدؒ کی طرف منسوب کر دیا ہے جو خلاف واقعہ اور غلط ہے، کیونکہ اس شکل کا نہ کتاب الاصل کی اس عبارت میں ذکر ہے جو جلد پنجم کے صفحہ ۱۹ سے خود قاضی صاحب نے نقل کی ہے اور نہ اس عبارت میں ذکر ہے جو اسی کتاب کے صفحہ ۱۹ پر ہے۔ بات یہ ہے کہ جب کوئی یہ ٹھان لے کہ مجھے دوسرے کی بات کا بہر طور جواب دینا اور اس کی تردید کرنی ہے تو بعض دفعہ غیر شعوری طور پر ایسی بات کہہ جاتا ہے جو خود اس کے نزدیک بھی درست نہیں ہوتی۔

غرضیکہ مذکورہ بالا تحریر سے یہ صاف واضح ہو جاتا ہے کہ معاملہ زیر بحث کے جواز سے متعلق محترم قاضی صاحب قول مجتہد پیش کرنے سے بھی قاصر رہے۔

اگر قاضی صاحب اس بارے میں "کتاب الحجۃ علیٰ اہل المدینہ" سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا وہ قول پیش کرتے جو امام محمدؒ نے ایک مسئلہ کے ضمن میں لکھا ہے تو اس کا مسئلہ زیر بحث سے ضرور کچھ تعلق تھا، لیکن انہوں نے شاید اس قول پر مشتمل کتاب الحجۃ کی عبارت کو اس وجہ سے پیش نہیں کیا کہ اس کتاب کا وہ مرتبہ نہیں جو امام محمدؒ کی دوسری کتابوں کا ہے۔ حنفی فقہ و فتاویٰ کی اہم کتابوں میں امام محمد کی دوسری کتابوں کے حوالے تو جا بجا بکثرت ملتے ہیں لیکن کتاب الحجۃ کے حوالے نہیں ملتے۔ یہ ایک مناظرانہ قسم کی کتاب ہے، ظاہر الروایات میں شامل نہیں۔ بہرحال وہ عبارت اس طرح ہے۔

"محمد قال، قال ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ فی الرجل یکون لہ علی الرجل مائۃ دینار الی اجل فاذا حلّت قال الذی علیہ الدین بعنی سلعۃ یکون ثمنہا مائۃ دینار نقدًا بمائۃ وخمسین الی اجل انّ ہذا جائز لانہما

ترجمہ: "امام محمدؒ نے کہا حضرت امام ابوحنیفہؒ نے ایسے معاملے کے متعلق فرمایا جس میں ایک شخص کے دوسرے شخص کے ذمے پر ایک خاص مدت کے لیے ایک سو دینار دین ہوں پھر جب ادائیگی کا مقررہ وقت آئے تو مدیون اپنے دائن سے کہے کہ آپ مجھ پر اپنی کوئی ایسی چیز جس کے نقد ثمن ایک سو دینار ہوں ڈیڑھ سو دینار میں ایک خاص

يشترط شيئًا ولم يذكر امرًا يفسد به الشراء وقال اهل المدينة لا يصلح هذا۔"

(ج ۲، ص ۶۹۴)

وقت تک بیچ دیجیے، یہ معاملہ جائز ہے کیونکہ اس میں فریقین نے نہ کوئی ایسی شرط لگائی اور نہ کسی ایسی چیز کا ذکر کیا جس سے معاملہ فاسد ہو جاتا ہے۔ لیکن اہل مدینہ نے کہا کہ یہ معاملہ درست نہیں"۔

مذکورہ عربی عبارت کے لفظی ترجمہ سے معاملے کی پوری تصویر واضح نہیں ہوتی، لہٰذا اس کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے کہ مدیون وقت مقررہ پر ادائیگی سے قاصر ہوا اور مزید مہلت حاصل کرنے کے لیے دائن سے کہے کہ آپ اپنی کوئی چیز جس کے نقد ثمن ایک سو دینار ہوں مجھ پر ڈیڑھ سو میں ادھار بیچ دیجیے، لینے کے بعد میں وہ چیز آپ کو واپس کر دوں گا، اس طرح ایک سو دینار ادا ہو جائیں گے اور ڈیڑھ سو میرے ذمہ باقی رہ جائیں گے جو میں اگلی مقررہ مدت پوری ہونے پر ادا کروں گا۔ گویا اس معاملے میں پچاس دینار مزید مہلت بڑھانے کے لیے زیادہ کیے گئے۔ کتاب الحجہ کی مذکورہ عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ایسا کرنا جائز ہے لیکن اہل مدینہ کے نزدیک ناجائز ہے۔ اس کے بعد کتاب الحجہ کی جو عبارت ہے اس میں امام محمدؒ نے سوال و جواب کے مناظرانہ طریقہ سے اہل مدینہ کے وہ دلائل بھی نقل کیے ہیں جن کی بناء پر وہ معاملہ مذکورہ کو فاسد و ناجائز کہتے تھے اور ساتھ ساتھ الزامی طور پر ان دلائل کا جواب بھی دیا گویا ان پر تنقید کر کے ان کو رد کیا ہے لیکن انداز محققانہ سے زیادہ مناظرانہ ہے۔ میں اس عبارت کو ترجمہ کے ساتھ یہاں اس لیے نقل نہیں کر رہا کہ سہو کاتب کی وجہ سے جیسا کہ محشی نے بھی لکھا ہے، اس میں کچھ حک و اضافہ ہوا، لہٰذا کچھ الجھ کر رہ گئی ہے۔ ایسی صورت میں اس کا ترجمہ کچھ مفید نہیں ہو سکتا۔ علماء کرام براہ راست اس کو کتاب الحجہ میں دیکھ سکتے ہیں جن کے پاس وہ موجود ہو، دراصل علماء کرام ہی اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کس کے دلائل میں کتنا وزن ہے۔ بہرحال کتاب الحجہ کی اس عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس معاملہ کے جواز و عدم جواز میں اختلاف رہا ہے۔ یہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جائز اور علماء مدینہ کے نزدیک ناجائز ہے۔ علماء مدینہ میں نمایاں نام حضرت امام مالکؒ کا ہے کیونکہ امام مالک نے "موطا" میں اس معاملے کو فاسد لکھا ہے اور یہ بھی کہ ہمیشہ علماء مدینہ اس معاملے سے روکتے اور منع کرتے رہے ہیں۔

موطا امام مالک کی وہ عبارت جس میں یہ بیان کیا گیا ہے درج ذیل ہے۔

قال مالك في الرجل يكون له على الرجل مائة دينار الى اجل فاذا حلت قال له الذي عليه الدين

ترجمہ: "امام مالکؒ نے اس معاملہ کے بارے میں جس میں ایک شخص کے دوسرے پر ایک مدت کے لیے ایک سو دینار بطور دین ہوں،

بعنی سلعة یکون ثمنها مائة دینار نقدًا بمائة وخمسین دینارًا الی اجلٍ، هذا بیع لا یصلح، ولم یزل اهل العلم ینهون عنه، قال مالک وانما کره ذٰلک لانه انما یعطیه ثمن ما باعه بعینه ویؤخر عنه المائة الاولیٰ الی اجل الذی ذکر له آخر مرة ویزداد علیه خمسین دینارًا فی تاخیره عنه فهذا مکروه ولا یصلح وهو ایضًا یشبه حدیث زید بن اسلم فی بیع اهل الجاهلیة انهم کانوا اذا حلّت دیونهم قالوا للذی علیه الدین اما ان تقضی واما ان تربی، فان قضی اخذوا والا زادوهم فی حقوقهم وزادوا فی الاجل"

پھر جب ادائیگی کا مقررہ وقت آئے تو مدیون اپنے دائن سے کہے کہ آپ اپنی کوئی چیز جس کی نقد قیمت ایک سو دینار ہو ایک خاص مدت کے لیے مجھ پر ڈیڑھ سو دینار میں فروخت کر دیجیے فرمایا کہ بیع کا یہ معاملہ درست اور جائز نہیں، مدینہ کے اہل علم ہمیشہ اس سے روکتے اور منع فرماتے رہے ہیں۔ (ظاہر ہے کہ یہ اہل علم صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ عظام ہی ہو سکتے ہیں) پھر امام مالک نے فرمایا کہ اس معاملے کو اس وجہ سے مکروہ (حرام) قرار دیا گیا ہے کہ اس میں مدیون دائن کو اس چیز کے ثمن بعینہٖ پورے دے دیتا ہے جو اس نے زیادہ ثمن پر بیچی تھی اور دائن پہلے سو دینار کی ادائیگی نئی مقرر کردہ مدت تک موخر کر دیتا ہے اور تاخیر کے بدلے پچاس دینار بڑھا دیتا ہے، لہٰذا یہ مکروہ (حرام) ہے اور درست نہیں۔ نیز یہ اہل جاہلیت کی اس بیع کے مشابہ ہے جس کا حضرت زید بن اسلمؓ کی حدیث میں ذکر ہے کہ اہل جاہلیت کا یہ طرز عمل و طریقہ تھا کہ جب ادائیگی کا مقررہ وقت آتا تو اپنے مدیون (قرضدار) سے کہتے ادا کرتے ہو یا مزید مدت کے بدلے دین کے مال کو بڑھانا چاہتے ہو۔ چنانچہ اگر وہ ادا کر دیتا تو لے کر معاملہ ختم کر دیتے ورنہ مدت کے اضافے کے ساتھ مال دین میں اضافہ کر دیتے۔"

موطا امام مالک کے ایک شارح نے ایک مثال سے اس معاملہ کی وضاحت اس طرح کی ہے، زید کے بکر کے ذمہ پر ایک ہزار دینار ایک مہینہ کے لیے قرض تھے، مہینہ پورا ہونے پر بکر ادائیگی کے قابل نہ تھا لہٰذا اس نے

ادھار چیز

مدتِ قرض مزید بڑھانے کے لیے ایک حیلہ نکالا۔ وہ یہ کہ زید سے کہا کہ آپ اپنی کوئی ایسی چیز جس کی بازار میں حاضر قیمت ایک سو دینار ہو مجھ پر ڈیڑھ سو دینار میں ادھار بیچ دیجئے۔ میں قبضہ کرنے کے بعد وہی چیز آپ کو سو دینار میں بیچ دوں گا یا کسی اور پر بیچ کر جو سو دینار ملیں گے آپ کو دے دوں گا۔ ایسا معاملہ ہو جانے سے زید کے جو سو دینار تھے وہ ڈیڑھ سو ہو جاتے ہیں اور بکر کو ادائیگی کے لیے مزید مہلت مل جاتی ہے۔

امام مالکؒ کے نزدیک اس معاملے کے فاسد اور حرام ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں جو خرید و فروخت ہوتی ہے وہ اصل مقصود نہیں ہوتی بلکہ اس میں اصل مقصود، مدتِ قرض کے عوض مالِ قرض کو بڑھانا ہوتا ہے۔ مدیون یعنی مقروض اپنے دائن و قرض خواہ سے ایک سو دینار کی کوئی چیز جو ایک سال کے لیے ایک سو پچاس دینار میں خریدتا ہے تو اس کا مقصد اس کے خریدنے سے پہلے قرض کی ادائیگی کے لیے مزید مہلت حاصل کرنا ہوتا ہے، گویا وہ جو مزید پچاس دینار اپنے ذمے لیتا ہے وہ مزید مہلت و تاخیر کا عوض ہوتے ہیں اور پھر چونکہ مزید مہلت و تاخیر کے عوض قرض کے مال میں اضافہ حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مطابق اس ربا النسیئہ کی تعریف میں آتا ہے جس کو قرآن حکیم نے حرام قرار دیا ہے، لہٰذا معاملہ مذکور حرام قرار پاتا ہے۔

امام ابو حنیفہ کے نزدیک اس معاملے کے جائز ہونے کی جو وجہ کتاب الحجہ کی مذکورہ عبارت میں بیان کی گئی ہے۔ یعنی یہ کہ چونکہ بظاہر اس معاملہ میں صراحت کے ساتھ کسی ایسی شرط وغیرہ کا ذکر نہیں جس سے معاملہ فاسد ہو جاتا ہو لہٰذا یہ جائز ہے، ایک ایسی دلیل ہے جو فقہاء احناف کے اس مسلّمہ فقہی قاعدہ کلیہ سے مطابقت نہیں رکھتی جس کے الفاظ اس طرح ہیں۔ "العبرۃ فی العقود للمقاصد والمعانی لا للالفاظ والمبانی" یعنی عقود و معاملات میں مقاصد اور معانی کا اعتبار ہوتا ہے الفاظ و عبارات کا اعتبار نہیں ہوتا۔ اگر یہ قاعدہ صحیح ہے دلیل مذکور ناقابل اعتبار قرار پاتی ہے، اور پھر چونکہ اس معاملہ میں ایک فریق کو اس کی چیز کا صحیح اور مساوی بدل نہیں ملتا جو حقیقی رضامندی کی علامت اور دلیل ہوتا ہے یعنی اس میں دائن اپنے مدیون سے جو پچاس دینار زائد لیتا ہے ان کا اس کی طرف مدیون کے لیے کوئی مادی عوض موجود نہیں ہوتا، لہٰذا اس میں مدیون کی حقیقی رضامندی نہیں پائی جاتی اور یہ معاملہ باطل کی تعریف میں آتا ہے۔

بہرحال اوپر جس اختلافی معاملے کا ذکر کیا گیا ہے اس کا تعلق دو ایسے اشخاص سے ہے جن میں سے ایک دائن اور دوسرا مدیون ہے، جبکہ ہمارے زیر بحث معاملے کا تعلق دائن و مدیون سے نہیں بلکہ دو عام آدمیوں سے ہے۔ تاہم دونوں معاملوں کے درمیان ایک گونہ مشابہت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ مشابہت ایسی نہیں جس کو معاملہ زیر بحث کے جواز کی دلیل بنایا جا سکتا ہو، کیونکہ معاملہ مذکور بجائے خود اپنے جواز کے لیے کتاب و سنت کی دلیل کا محتاج ہے۔ حضرت قاضی صاحب نے اپنے جواب میں اجل، وصف، وصف مرغوب و نامرغوب کی جو بحث چھیڑی ہے،

اس کے متعلق عرض ہے کہ اس میں ان کی یہ بات درست ہے کہ اجل، وصف ہے اور وصف کا کوئی عوض لیا جا سکتا ہے اور نہ دیا جا سکتا ہے اس کے درست ہونے کی وجہ یہ کہ وصف عرض ہے عین نہیں، اور عرض کا اپنا الگ سے مستقل وجود نہیں ہوتا بلکہ اس کا وجود کسی عین اور جوہر کے ساتھ ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں کہ عین کے بغیر عرض کی خرید و فروخت ہو سکے۔ بنا بریں اجل جو بقول قاضی صاحب کے وصف ہے اس کی الگ سے خرید و فروخت کا معاملہ خارج از امکان ہے۔ اس سلسلہ میں قاضی صاحب کا یہ لکھنا بھی درست ہے کہ وصف مرغوب بھی ہوتا ہے اور نامرغوب بھی، اور یہ کہ وصف مرغوب کی وجہ سے شے کی قیمت زیادہ اور نامرغوب کی وجہ سے شے کی قیمت کم ہوتی ہے۔ واقعی یہ بات عقل و فطرت کے مطابق ہے، لیکن یہ بات صرف اس وصف کی حد تک درست اور مطابق عقل و فطرت ہے جو شے کا ذاتی وصف ہوتا ہے، جو اس شے سے کبھی جدا نہیں ہو سکتا اور اس شے کی خرید و فروخت کے ساتھ ہمیشہ اس کی خرید و فروخت ہو جاتی ہے۔ قاضی صاحب نے جیّد و ردی اور عمدہ اور گھٹیا کھجوروں کی حدیث نبوی کے حوالے سے جو مثال دی ہے اس میں ظاہر ہے کہ جید اور عمدہ کھجوروں کا جو مرغوب وصف اور ردی و معمولی کھجوروں کا جو کم مرغوب یا نامرغوب وصف ہے وہ ان کھجوروں کی ذات میں موجود ہے خواہ ان کی تبادلے اور نقد سے خرید و فروخت ہو یا نہ ہو۔ اسی طرح وہ بات صرف اس وصف کی حد تک درست ہے جو خارج میں حواس سے محسوس ہوتا اور اس کا مرغوب یا نامرغوب ہونا کسی خاص شخص کے تعلق سے نہیں بلکہ عام لوگوں کے حوالے سے ہو، جیسا کہ عمدہ کھجوروں کا مرغوب وصف اور گھٹیا کھجوروں کا کم مرغوب وصف کہ اس کو سب محسوس کرتے اور خرید و فروخت میں اس کا لحاظ رکھتے ہیں۔ لیکن قاضی صاحب کی دوسری بات اس وصف کے لحاظ سے درست نہیں جو بیچی / خریدی جانے والی شے کے اندر حقیقت واقعہ کے لحاظ سے موجود نہیں ہوتا اور حواس سے محسوس نہیں کیا جاتا، بلکہ اعتباری ہوتا ہے اور جس کا وجود بعض اشخاص کے ذہن میں ہوتا ہے، عام لوگوں کے ذہن میں نہیں ہوتا۔

اب آیئے اصل مسئلہ کی طرف جس کے لیے قاضی صاحب نے یہ بحث تمہید کے طور پر اٹھائی ہے، یعنی یہ کہ اجل، وصف ہے اور مرغوب وصف ہے لہٰذا جس شے کے اندر یہ وصف پایا جاتا ہو اس کی قیمت بڑھ جانا عقل و فطرت کے عین مطابق ہے، جیسا کہ جیّد و عمدہ کھجوروں کی قیمت کا زیادہ ہونا ——— عین افسوس کہ قاضی صاحب کا یہ استدلال نہ عقل و فطرت کی رو سے درست ہے اور نہ دین و دانش کی رُو سے، کیونکہ اجل ہرگز ایسا وصف نہیں جو ادھار بیچی خریدی جانے والی چیز کے اندر پایا اور محسوس کیا جاتا ہو اور وہ صرف خریدار کے لحاظ سے نہیں بلکہ عام لوگوں کے لحاظ سے مرغوب ہو۔ مثال کے طور پر ایک مشین جس کی قیمت بازار میں ایک ہزار مقرر ہو نقد پر بیچی جائے یا ادھار پر، وہ اپنی حقیقت کے لحاظ سے یکساں رہتی ہے اور دونوں صورتوں میں اس کی افادیت میں کچھ فرق واقع نہیں ہوتا۔ اس مشین کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ مشین نقد والی ہے یا ادھار والی، معجل ادائیگی والی ہے یا موجل ادائیگی

والی اور یہ کہ یہ سب کے لیے مرغوب ہے یا نا مرغوب۔ ادھار کی صورت میں ادھار بیچی خریدی جانے والی چیز کے اندر اجل کا وصف اس طرح موجود نہیں ہوتا جس طرح مختلف قسم کی کھجوروں کے اندر ان کا وصف موجود ہوتا ہے، بلکہ اجل کا وصف ان دو اشخاص کے ذہن میں ہوتا ہے جو ادھار پر لین دین کرتے ہیں اور جو شخص دوسرے سے ادھار پر کوئی چیز بازار کی مقررہ قیمت سے زائد پر خریدتا ہے رغبت کی بنا پر نہیں خریدتا بلکہ اپنی اس مجبوری کی بنا پر خریدتا ہے کہ نقد خریداری نہیں کر سکتا۔ جو لوگ نقد پر خریداری کر سکتے ہیں وہ ادھار والی چیز سے رغبت نہیں نفرت کرتے ہیں، اس لیے کہ اس پر زیادہ دینا پڑتا ہے۔

اس ضمن میں قاضی صاحب کا لکھنا کہ "نفس اجل کا عوض لینا ناجائز ہے لیکن بوجہ اجل کے قیمت کا بڑھ جانا فطری و عقلی بات ہے" فطرت صحیحہ اور عقل سلیم کی رو سے درست نہیں، اس وجہ سے کہ نفس اجل کوئی ایسی شے ہے ہی نہیں جس کا عوض لیا دیا جا سکتا ہو، اور مال دَین میں اجل کی وجہ سے اضافے کا نام ربٰو ہے جس کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے، خواہ وہ شروع میں ہو یا پہلی مدت ختم ہونے کے بعد ہو مطلب یہ کہ اس میں کسی کو اختلاف نہیں کہ دین کی پہلی مدت ختم ہونے پر جب ادائیگی نہ ہو تو مزید مدت یعنی اجل میں اضافے کی وجہ سے مال دین کو مزید بڑھانا قطعی طور پر ربٰو ہے۔ اختلاف اس میں ہے کہ شروع میں اجل کی وجہ سے مال دین میں اضافہ جائز ہے یا جائز نہیں، جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ ادھار بیچی خریدی جانے والی چیز اگر ایسی ہے کہ بازاری نرخ کے مطابق لوگوں کے اندر اس کی کوئی ایک قیمت مقرر نہیں تو ایسی چیز بائع اور مشتری اپنی باہمی رضامندی سے جس ثمن میں چاہیں بیچ خرید سکتے ہیں، نقد کی صورت میں بھی اور ادھار کی صورت میں بھی۔ کیونکہ ادھار کی صورت میں نقد کے مقابلہ میں جو اضافہ ہوتا ہے وہ چیز کی اصل قیمت پر اجل کی وجہ سے اضافہ نہیں ہوتا اس لیے کہ یہاں اصل قیمت موجود ہی نہیں ہوتی اور نقد کے ثمن کو اصل قیمت نہیں کہہ سکتے، بلکہ اس میں احتمال ہوتا ہے کہ جو ادھار کے ثمن ہیں وہی اصل قیمت ہے۔ اور اگر وہ چیز ایسی ہے کہ بازاری نرخ کے مطابق اس کی قیمت مقرر ہے ناپ تول اور تعداد سے اس کی خرید و فروخت ہوتی ہے تو ایسی چیز نقد کی صورت میں جس ثمن پر بھی بیچی خریدی جاتے درست ہے، بشرطیکہ فریقین کی رضامندی سے ہو۔ البتہ ادھار کی صورت میں اس کی مقررہ اصل قیمت پر اجل کی وجہ سے اضافہ کو میں اسی طرح ربٰو سمجھتا ہوں جس طرح سب اہل علم حضرات اس اضافہ کو ربٰو سمجھتے ہیں جو نئی اجل کی وجہ سے مال دین میں کیا جاتا ہے۔

جہاں تک میرے مطالعے کا تعلق ہے ظہور اسلام کے زمانہ میں جو چیزیں ادھار پر بیچی خریدی جاتی تھیں وہ عموماً ایسی چیزیں تھیں جن کی بازاری نرخ کے مطابق قیمت مقرر نہیں ہوتی تھی، لہٰذا ان کی ادھار کی قیمت ہی اصل قیمت سمجھی جاتی تھی۔ تلاش و جستجو کے باوجود مجھے کوئی ایسی روایت نہیں مل سکی جس سے یہ ظاہر ہو کہ عہد رسالت اور عہد خلافت راشدہ میں کسی شخص نے کوئی چیز مقررہ قیمت سے زائد ثمن پر ادھار بیچی ہو اور کسی نے اس کو منع نہ کیا ہو۔

اگر قاضی صاحب یا دوسرے کوئی اہل علم اپنے وسیع مطالعے کی بنا پر کوئی ایسی روایت پیش فرما دیں جس میں یہ تصریح ہو کہ عہد رسالت اور عہد صحابہؓ میں فلاں شخص نے اپنی کوئی ایسی چیز جس کی بازاری قیمت مقرر تھی فلاں شخص کو بطور ادھار مقررہ قیمت سے زائد ثمن پر دی اور کسی نے اس کو ناجائز نہ کہا تو میں اپنے موقف سے رجوع کر لوں گا۔

قاضی صاحب موصوف نے اپنی تحریر میں مرحوم و مغفور حضرت مفتی سیاح الدین نور اللہ مرقدہ کے مضمون کا بھی ذکر کیا ہے جو کئی سال پہلے انہوں نے بڑی محنت و تحقیق سے لکھا اور اس میں ادھار کے مذکورہ معاملہ کو ربا تے حکمی سے تعبیر فرمایا۔ جن حضرات کو اس مسئلہ سے دلچسپی ہو وہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مضمون کو ضرور پڑھیں جو ماہنامہ "حکمت قرآن" لاہور کے جنوری ۱۹۹۲ء کے شمارہ میں شائع ہوا ہے۔ میرے اور مفتی صاحب مرحوم کے مضمون میں جو فرق ہے وہ صرف اسلوب بحث، انداز تحقیق اور طرز استدلال کا ہے، نتیجہ دونوں کا تقریباً ایک ہے۔ میری تو کوئی حیثیت نہیں، لیکن حضرت مفتی صاحب مرحوم کا عہد حاضر کے علماء دیوبند میں علمی اور فقہی خدمات کے لحاظ سے جو بلند مرتبہ تھا وہ کسی بیان کا محتاج نہیں لہٰذا اس موضوع پر ان کی تحریر کی خصوصی اور بڑی اہمیت ہے۔

آخر میں یہ عرض کر دینا مناسب بلکہ ضروری سمجھتا ہوں کہ معاملہ زیر بحث پر میں نے جو لکھا ہے اس سے میرا مقصد نہ کسی عالم دین کی تائید و موافقت کرنا اور نہ کسی کی تردید و مخالفت کرنا ہے۔ اور میں اپنے لکھے ہوئے کو حرف آخر اور سو فی صد صحیح و صواب نہیں سمجھتا۔ بہرحال میں نے عنداللہ اپنی مسئولیت کے تحت جو لکھا ہے وہ اپنی علمی تحقیق کا جو نتیجہ پیش کیا ہے مجھے رنج و افسوس ہے کہ وہ اس نتیجے سے مختلف رہا جو میرے بعض اکابر کی علمی تحقیق کا نتیجہ تھا میں یقین رکھتا ہوں کہ جن جلیل القدر علماء کرام نے معاملہ زیر بحث کو جائز لکھا ہے علمی دلیل کی بنیاد پر اور پوری دیانتداری کے ساتھ لکھا ہے۔ لہٰذا ان حضرات کے متعلق تجہیل و تفسیق کا خیال بھی گناہ کبیرہ ہے بیشمار علمی تحقیقات اور دینی خدمات کے لحاظ سے ان کا جو اعلیٰ مقام و مرتبہ ہے اس کے سامنے ہم جیسے لوگوں کی حیثیت وہ بھی نہیں جو سرچ لائٹ کے سامنے معمولی چراغ کی، اور میرا دل ان کی عقیدت و محبت اور ان کے ادب و احترام سے لبریز ہے، حتیٰ کہ ان کے تصور اور ذکر سے بھی ایمان تازہ ہوتا ہے اور چونکہ انہی بزرگوں کی یہ بھی تعلیم و تلقین رہی ہے کہ آپ دینی علم اپنے علم و فہم کے مطابق جس بات کو حق سمجھے اور اس کے اظہار میں اسلام اور مسلمانوں کی خیر و بھلائی دیکھے بلا خوف لومۃ لائم اس کا اظہار کرے، لہٰذا میں نے جو لکھا ہے ان کی منشاء کے عین مطابق ہے خاتمے پر پھر یہی گذارش ہے کہ اگر کوئی صاحب دلائل کے ساتھ میرے لکھے کو غلط ثابت کر دیں تو میں بلا تامل اپنی غلطی کا اعتراف اور اعلان کر دوں گا۔

جہاں تک برا بھلا کہنے والوں کا تعلق ہے انہوں نے کب کسی کو بخشا ہے وہ اپنی باطنی کیفیت کا اظہار ان کی فطرتی مجبوری ہے۔ اللہ معاف کرے۔

محفوظ قابلِ اعتماد مستعد بندرگاہ

بندرگاہ کراچی

جہازرانوں کی جنّت

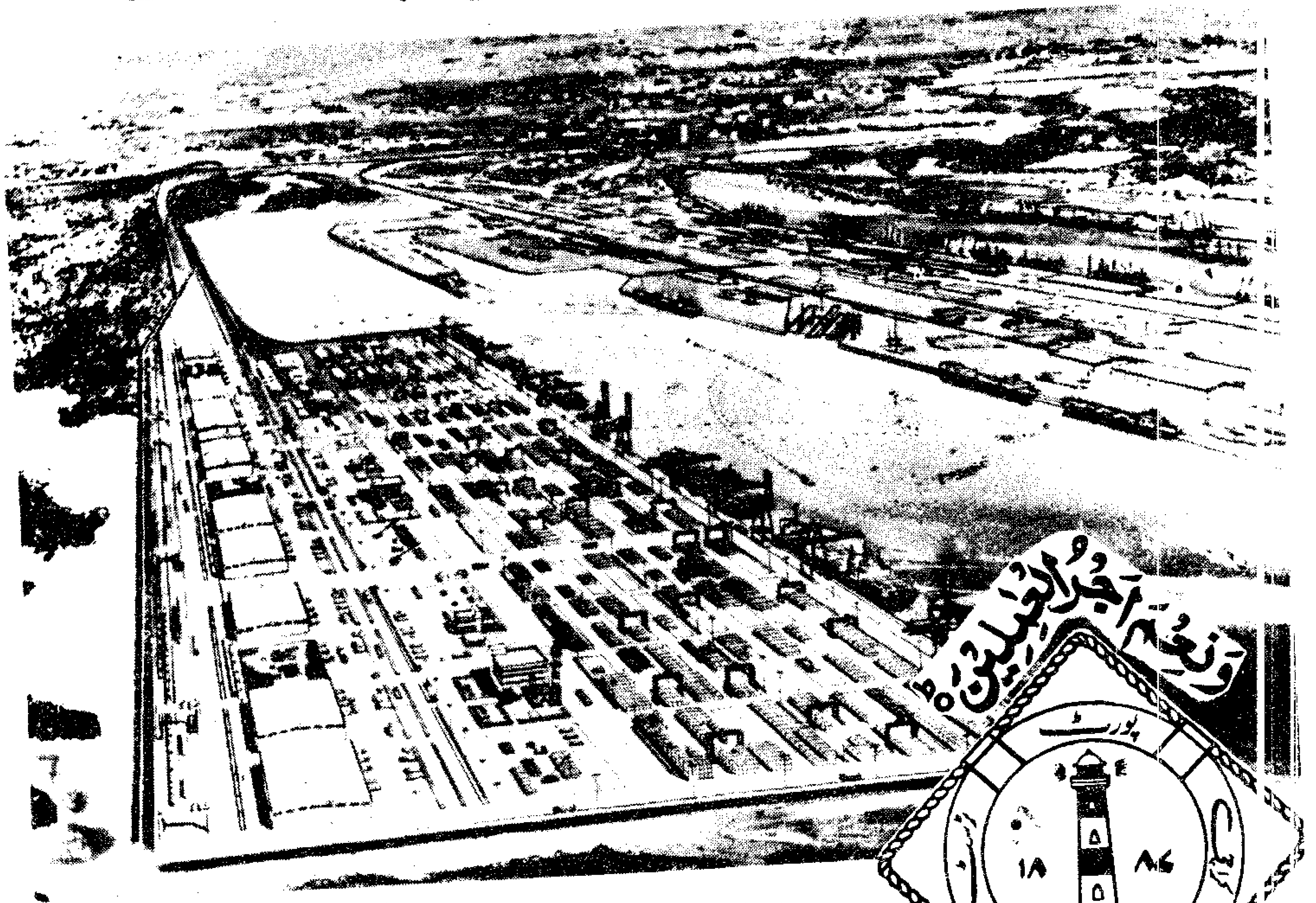

بندرگاہ کی خدمات کے جدید انداز کے ساتھ
عالمی تجارت کے لئے پُرکشش
پاکستانی معیشت کی تعمیر کے لئے کوشاں

ہماری کامیابیوں کی بنیاد

- انجنیئرنگ میں کمالِ فن
- مستعد خدمات
- جدید ٹیکنالوجی
- باکفایت اخراجات
- مسلسل محنت

۲۱ ویں صدی کی جانب رواں

بمع

جدید مربوط کنٹینر ٹرمینلز
نئے میرین پروڈکٹس ٹرمینل
بندرگاہ کراچی ترقی کی جانب رواں

PID · Islamabad

اپنی جہازراں کمپنی

پی این ایس سی

کے

جہاز

سے مال بھیجئے

بروقت ۔ محفوظ ۔ باکفایت

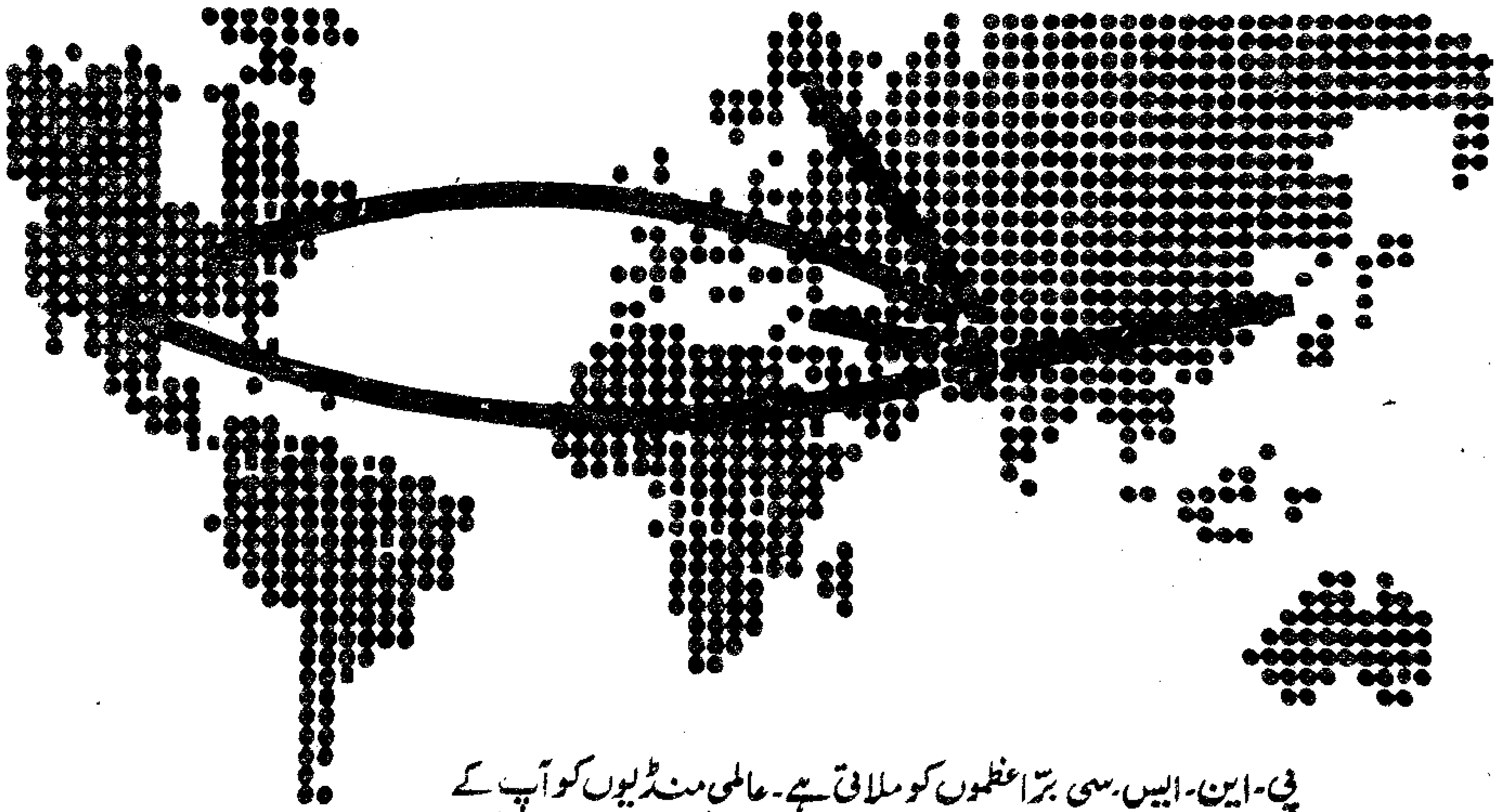

پی۔این۔ایس۔سی برّاعظموں کو ملاتی ہے۔ عالمی منڈیوں کو آپ کے قریب لے آتی ہے۔ آپ کے مال کی بروقت، محفوظ اور باکفایت ترسیل برآمدکنندگان اور درآمدکنندگان، دونوں کے لئے نئے مواقع فراہم کرتی ہے۔

پی۔این۔ایس۔سی قومی پرچم بردار۔ پیشہ ورانہ مہارت کا حامل جہازراں ادارہ، ساتوں سمندروں میں رواں دواں

قومی پرچم بردار جہازراں ادارے کے ذریعہ مال کی ترسیل کیجئے

پاکستان نیشنل شپنگ کارپوریشن

قومی پرچم بردار جہازراں ادارہ

PNSC 2 88 PID - Islamabad

PARAGON/A